کی رائے (جو کہ اکثریت کی رائے تھی) کے برعکس حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رائے کے مطابق فیصلہ فرمایا (روح المعانی جلد دوئم ص۲۶)

بخاری میں ہے کہ صلح حدیبیہ میں جب سہیل نے یہ شرط بھی لگوائی کہ اگر ہم میں سے کوئی آدمی آپؐ کے پاس چلا جائے اور وہ مسلمان ہو گیا ہو تو آپؐ اس کو ہماری طرف واپس کر دیں ہم جو چاہیں اس کے ساتھ کریں۔ سہیل نے کہا میں تو اسی شرط پر صلح کروں گا اور مسلمانوں نے اس شرط کو برا مانا اور ناراض ہوئے۔ انھوں نے گفتگو کی (کہا کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کو کافروں کے سپرد کر دیں) سہیل نے کہا یہ نہیں ہو سکتا تو صلح بھی نہیں ہو سکتی۔ آخر کار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ شرط منظور کر لی اور صلح نامہ لکھوایا۔" فرمائیے کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کی رائے (برا ماننا اور ناراضگی) کی کوئی پروا کی۔ بخاری میں ہی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسامہ کو لشکر کا سردار بنایا اس پر لوگوں نے باتیں بنائیں (کہنے لگے کہ بوڑھوں کو چھوڑ کر آپؐ نے ایک چھوکرے کو سردار بنایا ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا ـــــ میں نے سنا تم لوگ جو باتیں اسامہؓ کے باب میں کرتے ہو! دیکھو اسامہؓ مجھے سب لوگوں سے زیادہ پیارا ہے"۔ بلکہ آپؐ نے خطبہ دیا جس میں فرمایا "اگر تم اسامہؓ کی سرداری پر طعنہ مارتے ہو (تو کچھ تعجب نہیں) اس سے پہلے تم اس کے باپ (زیدؓ) کی سرداری پر طعن کر چکے ہو۔ قسم خدا کی وہ سرداری کے لائق تھا اور سب لوگوں سے مجھے پیارا تھا اس کے بعد یہ اسامہؓ (اس کا بیٹا) سب لوگوں سے مجھے پیارا ہے" (بخاری) اب بتائیے کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسامہؓ اور ان کے والد زیدؓ کو لشکر کا سردار بناتے ہوئے لوگوں کی رائے کو نظر انداز نہیں کر دیا تھا۔ صلح حدیبیہ اور لشکر اسامہؓ کے سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر دو مقام پر اعتراض کرنے والوں کی تعداد اکثریت کا درجہ حاصل نہیں کر سکی، لیکن اس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ صرف چند ایک صحابہ کی کوئی سی رائے یہ نتیجہ نہیں پیدا کر سکتی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے "انتخاب" کے سلسلہ میں خطبہ دینا پڑے اور ناراضگی کا اظہار کرنا پڑے۔ دوسری طرف حدیبیہ میں یہ تک کہنا پڑے۔ "میں اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسولؐ ہوں، میں اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا" (حیاۃ محمدؐ، محمد حسین ہیکل) اس کے باوجود جب صلح حدیبیہ طے پا جاتی ہے تو پھر بھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سوا باقی تمام

مسلمان حضرت عمرؓ کی رائے کے حامی نظر آتے ہیں (فتح الباری) یہاں تک کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب قربانی کرنے کا حکم دیا تو کوئی بھی مسلمان قربانی کرنے کے لیے کھڑا نہ ہوا اور آپؐ نے تین مرتبہ حکم دیا پھر بھی یہی ردِ عمل ظاہر ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ جنگ احد باہر لڑنے کا فیصلہ بھی کثرت رائے کی بجائے عزم رسولؐ کے تحت ہوا ہے کیونکہ جس اکثریت نے باہر لڑنے کا مشورہ دیا تھا وہ بھی بزرگوں کے سمجھانے پر اپنے موقف سے دستبردار ہو گئی تھی اور واضح الفاظ میں عرض کی تھی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاں چاہیں لڑائی لڑنے کا فیصلہ کریں تو آپؐ نے فرمایا کسی نبی کو لائق نہیں کہ وہ زرہ پہن کر اتار دے جب کہ خدا فیصلہ نہ کر دے (فیض الباری)

میں ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے یہ حقیقت رقم کرنے میں تذبذب محسوس نہیں کرتا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی ایک ایسی کتاب کی طرح ہم سب کے سامنے ہے جس کے کسی بھی ایک صفحے پر کسی بھی جگہ انگلی رکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی بھی کوئی فیصلہ صرف اس لیے کیا کہ "اکثریت" اس موقف کی حامی تھی۔

مجبوری کی زنجیریں اور اصولوں کا خون

مشورے کی غرض وغایت اور اس کے درست طریق کار کو شعوری یا غیر شعوری طور پر تسلیم نہ کر کے ہم جمہوریت کی دیگر قباحتوں کو بھی سینے سے لگانے پر مجبور ہی نہیں ہو جاتے بلکہ ہمیں اپنی مجبوری کے ساتھ ساتھ ان قباحتوں کا احساس تک نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ جمہوریت پر ایمان لانے والا مسلمان طبقہ جمہوریت کی ہر قباحت کو خوبصورت تصور اور نکتہ ثابت کرنے میں مصروف ہے۔ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ مشورہ ان سے لیا جاتا ہے جو اس کے اہل ہوں تو ارشاد ہوتا ہے آخر ہمارے پاس کون سی کسوٹی ہے جسے استعمال کر کے ہم معلوم کر سکیں کہ کون مشورہ دینے کا اہل ہے۔ یہ دلیل اتنی مضحکہ خیز ہے کہ اسے جھٹلانے اور غلط قرار دینے کے لیے دلائل دینا ہی وقت کا ضیاع ہے کیونکہ ہر شخص کو ہر روز مختلف امور میں مشورے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ مشورہ لیتا ہے آخر کس کسوٹی سے اپنے مشیروں کو پرکھتا ہے کیا وہ ہر کام کے سلسلے میں ہاتھ کھڑے کراتا ہے اور انہیں گن کر فیصلے کرتا ہے۔

ہر فرد سے مشورہ لینے کے ضمن میں سورہ النور کی آیت نمبر ۵۵ کا حوالہ دیا جاتا ہے جس میں

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے۔" سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس آیت سے یہ مراد لی ہے کہ "خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے یہ نہیں کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ یہاں ہر شخص خلیفہ ہے کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں ہے کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کرکے خود ہی حاکم مطلق بن جائے۔ جہاں جو شخص حکمران بنایا جاتا ہے اس کی اصل حیثیت یہ ہے کہ تمام مسلمان یا اصطلاحی الفاظ میں تمام خلفاء اپنی رضا مندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لیے اس کی ذات میں مرکوز کر دیتے ہیں وہ ایک طرف خدا کے سامنے جواب دہ ہے اور دوسری طرف ان عام خلفاء کے سامنے جنھوں نے اپنی خلافت اس کو تفویض کی ہے۔" (اسلام کا سیاسی نظریہ) ایک طرف اس آیت سے یہ مراد لی جاتی ہے تو دوسری طرف اس آیت کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ "ارشاد سے مقصود منافقین کو تنبیہ کرنا ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کو خلافت عطا کرنے کا جو وعدہ کیا ہے اس کے مخاطب محض مردم شماری کے مسلمان نہیں ہیں اس کے مخاطب وہ مسلمان ہیں جو صادق الایمان ہوں، اخلاق اور اعمال کے اعتبار سے صالح ہوں۔ اللہ کے پسندیدہ دین کا اتباع کرنے والے ہوں اور ہر طرح کے شرک سے پاک ہو کر خالص اللہ کی بندگی و غلامی کے پابند ہوں۔ ان صفات سے عاری اور محض زبان سے ایمان کے مدعی لوگ نہ اس وعدے کے اہل ہیں اور نہ یہ ان سے کہا گیا ہے لہٰذا وہ اس میں حصہ دار ہونے کی توقع نہ رکھیں۔" (تفہیم القرآن جلد سوم ص ۴۰۴)

اس مراد اور اس تشریح یا تفہیم کے تضاد کی "حکمتِ عملی" کو سمجھنے سے کم از کم میں قاصر ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے مجھے اب تک اس فلسفہ کی سمجھ نہیں آسکی کہ ایک طرف تو ابھی "پروانوں" کو قربان ہونے کے جذبہ سے عاری قرار دیا جاتا ہے دوسری طرف اچانک انہی پروانوں سے کہا جاتا ہے کہ اس "شمع" پر قربان ہو جاؤ کیونکہ ایک بڑے "بھنورے" سے مقابلہ کرنا ہے۔ اور ایک طرف "بیلوں" کو ہل کھینچ سکنے کا اہل قرار نہیں دیا جاتا تو دوسری طرف انہی بیلوں سے کہا جاتا ہے کہ اس "ہل" کے آگے جُت جاؤ کیونکہ ہمیں اس زمین پر قبضہ کرنا ہے جس پر ایک "جاگیردار" قابض ہے!